Fikr-o-Nasar (Islamabad) vol. 1:11 (1964)

انتخاب

(شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، ملک کے ان معدودے چند فعال علمی اداروں میں سے ہے جن پر پاکستانیوں کو بجا طور پر ناز ہے۔ اس اکیڈمی کے علمی مجلّہ "الرحیم" کی ادارت حکمت ولی اللّٰہی کے مشہور شارح پروفیسر محمد سرور صاحب کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ انہوں نے "الرحیم" کی تازہ اشاعت میں ولی اللّٰہی تعلیمات کی روشنی میں "دین کے دو اجزا: حکمت و فقہ" کا جائزہ لیا ہے۔ اس فاضلانہ مقالہ کا انتخاب ہم رسالہ "الرحیم" کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کر رہے ہیں۔ مدیر)

دینِ اسلام مجموعہ ہے حکمت اور شریعت و فقہ[1] کا۔ حکمت دین کی عمومی حیثیت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی حکمت میں جتنی عربیت ہے اُتنی ہی عجمیت، ترکیت، فرنگیت بھی ہے۔ اس حکمت سے ایک عرب جس طرح مستفید ہو سکتا ہے، اُسی طرح دوسری قوم کا آدمی بھی جس کی زبان عربی نہ ہو، اس سے انسان میں تلاش و تفحص، نظر و فکر اور تقدم و تبدیلی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اُسے اس محدود دنیا سے ورائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے اُس کی نظر کے سامنے وسیع و عمیق آفاق وا ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن حکمت کے زیر اثر سوچنے پر مجبور رہتا ہے، وہ اپنی ارد گرد کی دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور نئی نئی راہیں ڈھونڈھتا ہے، مختصراً حکمت میں عمومیت حرکت و تقدم ہے۔

فقہ نام ہے نظام کی مدوّن شکل کا۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اُس کے مطابق اُسے قواعد و ضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ اگر زندگی ان قواعد و ضوابط سے آزاد ہو جائے اور انسان کسی ایسے ضابطۂ قانون

---

[1] ہر قوم و ملت کے لئے ایک سنت و شریعت اور کچھ شرائع و احکام ہوا کرتے ہیں، جن میں وہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کی عادات و اطوار کی پیروی کرتے ہیں۔۔۔۔ اس طرح ملت و مذہب کی بنیادیں اُستوار ہو جاتی ہیں۔۔۔۔ حجۃ اللہ البالغہ ص [illegible]

کا پابند نہ رہے، ہواس کے اعمال کو قاعدے میں رکھے، تو اس کا نتیجہ بدنظمی اور تاراج ہوتا ہے۔ فقہ کی روح حکمت ہے لیکن اس کا ڈھانچہ عملی مظہر ہوتا ہے ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں اُس حکمت کی تعبیر کا۔ اب حکمت میں جہاں عمومیت اور دوام ہے، وہاں فقہ میں مقامیت اور تحدید ہے۔ اور اس جہان آب و گل میں ہر کمال کے لئے تحدید ضروری ہے، چنانچہ کوئی حکمت اُس وقت تک فائدہ بخش نتائج نہیں پیدا کر سکتی، جب تک کہ وہ ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں عملی ضابطوں کی شکل اختیار نہ کرے اور اس ضمن میں اس ماحول اور اُس زمانے کی ضرورتوں کا خیال نہ رکھے۔

غرض زندگی میں فقہ یعنی مدون قانون کی بھی ضرورت ہے اور حکمت کی بھی۔ اگر دونوں میں توازن اور ہم آہنگی رہے تو انسان آگے بھی بڑھتا ہے اور ماضی و حال سے بھی اُس کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ حکمت حرکت و اقدام اور فقہ اثبات و استحکام کا باعث بنتی ہے۔ اگر فقہ سے بے اعتنائی ہو، تو زندگی میں نظم و ضبط نہیں رہتا۔ اور اگر فقہ ہی فقہ زندگی پر حاوی ہو جائے تو اس کا نتیجہ جمود، قدامت پرستی اور فکر و نظر کی موت ہے۔

اب قرآن مجید جس حکمت کا حامل اور پیغام بر ہے، وہ اس کی متقاضی تھی کہ اس میں زیادہ سے زیادہ عمومیت اور ہمہ گیریت ہو، لیکن دوسری طرف اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس حکمت کے اصولوں پر قانون مدوّن ہو۔ اور اس کی تدوین میں جن لوگوں کے لئے اور جس زمانے کے لئے یہ قانون مدوّن ہو، ان کی خصوصیات اور طبعی رجحانات کا خیال رکھا جائے۔

اسلام کی تعلیمات کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلیؒ "الکلام" میں لکھتے ہیں :۔

مذہب کے متعلق بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ انبیاء کے اصول طریقۂ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے، علم کلام کی کتابوں میں اس ضروری نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابن رشد نے کشف الادلہ میں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اصول بیان کئے ہیں، ان میں سے ضروری الذکر یہ ہیں :۔

(۱) انبیاء کو اگرچہ عوام و خواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے، اس لئے ان کے طرز تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے۔ البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں.....

ابن رشد فصل المقال میں لکھتے ہیں :۔ "شریعت کا مقصود اولیٰ جمہور عوام کے ساتھ اعتناء کرنا ہے۔

تاہم خواص کی تنبیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاتی۔

(۲) انبیار لوگوں کی عقل وعلم کے لحاظ سے اُن سے خطاب کرتے ہیں، لیکن اس علم وعقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد میں پائی جاتی ہے...... شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: "اور انبیار کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں"......

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ انبیار تہذیب اخلاق او رتزکیۂ نفس کے سوا اور قسم کے مسائل اور مباحث وحقائق سے متعرض نہیں ہوتے۔ اور اس قسم کے امور کے متعلق جو بیان کرتے ہیں تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق اور اس میں بھی استعارات ومجازات سے کام لیتے ہیں......

(۴) ایک عام اصول جس پر تمام انبیار کا عمل رہا، یہ ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے اکل وشرب، لباس، مکان، سامان آرائش، طریقۂ نکاح، زوجین کے عادات بیع وشرا، معاصی پر دار وگیر فصل قضایا غرض اس قسم کے تمام امور پر نظر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسا اُن کو ہونا چاہیئے تو پھر کسی قسم کا تبدل وتغیر نہیں کرتے، بلکہ ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ رسوم وآئین صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں۔ البتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ مثلاً وہ آزار رسانی کا ذریعہ ہوں یا لذات دنیوی میں انہماک کا باعث ہوں، یا اصول احسان کے مخالف ہوں یا انسان کو دنیاوی اور دینی مصالح سے بے پروا کر دینے والے ہوں، تو ان کو بدل دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں، بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں، جس کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ یا اُن لوگوں کے حالات میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جن کو قوم اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے۔ شاہ صاحب یہ اصول نہایت تفصیل سے بیان کر کے لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے انبیار کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق، معاملات، آرائش، لباس، قضا، تعزیرات، غنیمت میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی، جس کو وہ لوگ سرے سے نہ جانتے ہوں یا ایسی جس کے قبول کرنے میں ان کو پس وپیش ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی دفع کر دی گئی۔

(۵) انبیار پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد و مسائل جو مذہب کے اصول کلیہ ہوتے ہیں۔ اس حصے میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا کا وجود، توحید، ثواب، عقاب، شعائر اللہ کی تعظیم، نکاح، وراثت وغیرہ۔ دوسرے وہ احکام اور سنن جو خاص خاص انبیار کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے، شریعت کا حصہ خاص

خاص ملکوں اور قوموں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد زیادہ تر ان خیالات، عقائد، عادات، معاملات رسوم، طریق معاشرت اور اصول تمدن پر ہوتی ہے، جو پہلے سے اس قوم میں موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں، اسی طرح شریعت میں ان علوم اور اعتقادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو قوم میں معروف اور جاری وساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسماعیل پر حرام نہ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں۔"

آگے چل کر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اصول تمام انبیاء میں مشترک ہوتے ہیں، لیکن جس نبی کی رسالت عام ہوتی ہے اور تمام عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوتا ہے اس کی ہدایت اور تلقین میں بھی بعض زائد خصوصیات ہوتی ہیں، جو اور انبیاء میں نہیں پائی جاتیں۔ اس اصول کی وضاحت شاہ ولی اللہ صاحب رح یوں فرماتے ہیں: "یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے، اس کو اور چند اصولوں کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی شریعت کی اصل بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اس کی قوم کے عادات اور مسلمات کے اصول بھی لئے جائیں اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو ہر زمانے میں یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں۔ اس سے تو شریعت کا جو مقصود ہے وہ بھی فوت ہو جائے گا۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ قوم کی عادات اور خصوصیات کا پتہ لگایا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ خاص اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

اس کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اس اصول سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ شریعت اسلامی میں چوری زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ (یہاں مولانا شبلی کا بیان ختم ہوتا ہے)

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں اُس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا گیا ہے، جس میں وہ نازل ہوا، اور جو اس کے اولین مخاطبین تھے، لیکن اس سے قرآن مجید کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ایسے احکام جو ان عادات اور حالات کی بناء پر ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مولانا سندھی رح اس بارے میں فرماتے تھے کہ قرآن میں کہیں کہیں جو اس قسم کے احکام ہیں، اُن کی حیثیت ایک عملی مثال کی ہے، یعنی عرب کے ان حالات میں قرآن مجید کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔

مولانا سندھی رح کے نزدیک وہ علماء جن کے پیشِ نظر عام انسانیت کی مجموعی ترقی اور بہبود ہوتی ہے وہ انبیاء کی تعلیمات کے عمومی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان کے ہاں انبیاء کے وہ احکام اور قوانین جو کسی خاص قوم اور ایک خاص زمانے کے مخصوص حالات کے تحت مرتب ہوتے ہیں، وہ عالمگیر اور دائمی نہیں ہوتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا شمار انہی علماء میں ہوتا ہے۔ آپ نے اول تو تمام انبیاء کی تعلیمات کی مشترکہ اساس متعین کی، جو آپ کے نزدیک انسانیت عامہ کے مطابق ہے۔ اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی اس حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا ہے کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو، یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو سرے سے نہیں مانتا، انسانیت عامہ کی فلاح بہبود کا کام کرتا دیکھوں، تو میرے دل میں اس کی عزت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کی حکمت سے میں یہ سمجھا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد انسانیت کی بھلائی اور ترقی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خدمت سر انجام دیتا ہے، تو میں اُس سے کیسے نفرت کروں۔

غرض حکمت عام ہے اور وہ انسانیت عامہ کی اساس ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر جو قانون بنتا ہے اُس میں ماحول کی ضروریات ملحوظ ہوتی ہیں۔ بقول مولانا سندھی: - ایک خاص زمانے میں جو نظام بروئے کار آتا ہے، وہ آخری نہیں ہوتا۔ وہ انسان کو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جانے کے قابل بناتا ہے۔ جہاں تک اس خاص مرحلے کا تعلق ہوتا ہے، اس کے لحاظ سے تو اس نظام کی حیثیت آخری ہوتی ہے لیکن مجموعی انسانیت کے لئے یہ ایک مثال یا نمونہ ہوتا ہے۔ لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کل حقیقت کا مرادف سمجھ لیتے ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم و ملک میں اس نظام کو بجنسہٖ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے ذہین طبقوں میں اس نظام سے بے دلی پیدا ہونے لگتی ہے جسے غلطی سے اُس اصل اصول سے بے دلی سمجھا جاتا ہے، جس کا یہ نظام

ایک علی مظہر ہوتا ہے۔ اب اگر نظام کو ایک مثال کی حیثیت دی جاتی اور افراد کو اجازت ہوتی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اس کو ضرورتوں کے مطابق بدل سکتے اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُس میں بھی ارتقا ہوتا تو انسانیت شاہراہِ ترقی پر برابر گامزن رہتی۔ زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک تسلسل بھی چاہتی ہے، اگر نظام میں تغیر و تبدل کا یہ راستہ اختیار کیا جائے تو زندگی کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور ترقی بھی نہیں رُکتی۔

حکمت اور فقہ دین کے دونوں جزو ہیں، اور زندگی میں دونوں کی ضرورت ہے، لیکن اگر فقہ کو سب کچھ سمجھ لیا جائے، اور اُسے اُسی شکل میں قائم رکھنے پر اصرار ہو، جو ایک زمانے میں اس کی متعین ہوئی تھی، تو نہ صرف ایسی فقہ حکمت سے تہی دامن ہو جائے گی بلکہ علی زندگی میں اُس کی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

انتخاب از مقالہ
"دین کے دو جزو : حکمت اور فقہ"
از پروفیسر محمد سرور "الرحیم" حیدر آباد
اپریل ۱۹۶۴ء